نظارۃ المعارف القرآنیہ

برعظیم میں خدمتِ قرآنی کا ایک روشن باب

حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہ
خلف الرشید و جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علیؒ
کے قلم سے

"نظارۃ المعارف القرآنیہ کے مقاصد قوم کے گوش گذار ہو چکے ہیں اور میرے ل کی یہ بات ہے کہ ان مقاصد کو اہم مقاصد خیال کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ س کا یقین بھی رکھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مولوی عبید اللہ صاحب (سندھی) صرف وہ شخص واحد ہیں جو ان مقاصد کو انجام دے سکتے ہیں، ان کی ذات خود یک مدرسہ اور دار العلوم ہے وہ جہاں بیٹھ جائیں اس کو نظارۃ المعارف کہہ سکتے ہیں، میں نے ۲۸ مارچ ۱۹۱۴ء کو اس درسگاہ کو دیکھا ایک مختصر سا کمرہ فتح پوری کی مسجد کے حوالی میں ہے جو داخل مسجد ہے، چند طلباء اس وقت مصروف درس تھے، میں نے حیرت سے دیکھا کہ چند گریجویٹ جن کے لئے زمین پر بیٹھ کر سبق پڑھنا نہایت نفس کشی کا کام ہے بڑے شوق سے اس نفس کشی میں مشغول ہیں۔ اس سلسلہ سے بہت سی امیدیں ہیں۔ میرا جو خیال تھا کہ زمانہ حال کے موافق علماء پیدا کئے جائیں اور انگریزی خوانوں کو عالم بنایا جائے، وہ اسی طریقہ سے پورا ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے۔ خدا مولوی صاحب موصوف کو جزائے خیر دے اور ندوۃ (العلماء) کو چشم بصیرت کہ جو کام اس نے پیش نظر رکھا تھا وہ یہاں ہو رہا ہے۔"

حضراتِ گرامی، ابھی آپ نے جو طویل اقتباس سماعت فرمایا یہ سیرۃ النبیؐ، الفاروق اور النعمان جیسی کتابوں کے مصنف اور مشہور اسکالر علامہ شبلی نعمانی کا ہے، جنہوں نے ۲۸ مارچ ۱۹۱۴ء کو نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کا معائنہ کیا

اور معائنہ کے بعد یہ رائے تحریر کی - اس ادارہ کے ایک طالب علم مرزا اسحاق
بیگ مراد آبادی نے مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے ہمدرد کو یہ رائے ارسال کی جیاں
ہمدرد کی اشاعت ۱۷ اپریل ۱۹۱۴ء میں یہ شائع ہوئی اور ابھی حال ہی میں "نامہ
شبلی" کے عنوان سے ان کی متعدد تحریرات اور مکاتیب کے ساتھ یہ سطور بھی یونیو
اورینٹل کالج کے مجلہ میں افضل حق قرلیشی کی وساطت سے سامنے آئی ہیں

اس ادارہ سے سب سے پہلے جو صاحب فارغ ہوئے ان کا نام پیر
مصباح الدین احمد صدیقی ہے جو ضلع رہتک کے صدیقی خانوادہ کے چشم و
چراغ ہیں — اس خاندان کے بزرگوں کی محنت اور تبلیغ کے نتیجہ میں ہلو
گوڑگاؤں، کرنال، حصار وغیرہ اضلاع میں متعدد قبائل اسلام لائے اور اس
خاندان کے متعدد افراد کو ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی میں شہید کیا گیا - رحمہم
اللہ تعالیٰ -

پیر مصباح الدین ریٹائرڈ پی-ای-ایس ہیں اور آجکل اسلام آباد میں
مقیم ہیں - ان کے اہم ترین ساتھیوں میں مشہور خادم قرآن خواجہ عبدالحی
صاحب تھے جو دہلی کی ایک دوسری درسگاہ **جامعہ ملیہ** جس کا
سنگ بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں
علی گڑھ میں رکھا پھر یہ درسگاہ دہلی منتقل ہوئی، اس میں خواجہ صاحب سال
قرآنی علوم پڑھانے پر مامور رہے اور تقسیم ملک کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے
روڈ لاہور میں اسلامیات کے سربراہ ہوئے -

پیر مصباح الدین صاحب کو جو سند ملی اس پر بحیثیت ناظم نظارۃ
المعارف مولانا احمد علی لاہوری کے دستخط ہیں ۲۳ شعبان ۱۳۴۴ھ کی
تاریخ ہے - مہر میں مسجد فتح پوری کا عکس ہے اور وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ
لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ کی معروف آیت کریمہ کے ساتھ ساتھ انما
انا قاسم واللہ یعطی کی حدیث بھی مندرج ہے - یہ ادارہ ۱۹۱۳ء
میں دہلی میں قائم کیا گیا اور اس کے بانی و موسس اصولی طور پر حضرت شیخ
الہند مولانا محمود الحسن تھے پہلے ناظم و مدرس مولانا عبید اللہ سندھی، جبکہ ان کے
ہا

سحاۃ

ی جان کار مولانا احمد علی لاہوری تھے اور جب ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی
یں نا استاذ گرامی شیخ الہند کے حکم سے کابل تشریف لے گئے تو مولانا احمد علی
ی یونیو ذمہ دار قرار پاتے ریشمی رومال تحریک کا راز فاش ہونے پر مولانا احمد علی
ے آئی رفتاریوں کا جو سلسلہ شروع ہوا مولانا احمد علی بھی اسکی نذر ہو گئے اور
پس یہ ادارہ وقتی طور پر بند ہو گیا۔
لے جہۃ مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی خود نوشت میں نظارۃ المعارف کے
میں الق چند جملے لکھے ہیں، مولانا فرماتے ہیں "حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے
ادارا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی
۔ رس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خان اور نواب
رالملک ایک ہی طرح شریک تھے ۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال
م آباد بند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے
ید انجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف
یس لے آتے، اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے
ذا مجھے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر سے ملایا، اس طرح تخمیناً دو
ا حسال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا"
بلو۔ (سرگزشت کابل صہ ۱۱ مطبوعہ اسلام آباد ۱۹۸۰ء)
اس ادارہ کی ہیئت کذائی، مقاصد اور تاریخ کو

ظ سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قیام سے حضرت شیخ الہند ان
مر کیانیاں گرامی کو قرآن کی روشنی سے منور کرانا چاہتے تھے جو حالات کی سردمہری
قمر ا شکار ہو گئے تھے۔ اس تلخ اور افسوسناک حقیقت کو جھٹلانا بڑا مشکل ہے
ز انہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ خونی کے بعد ہندوستان بھر کا مسلمان بری طرح متاثر
۱۹۱۲ء۔ حکومت گئی، کاروبار گئے، مدارس اور خانقاہیں اجڑیں اور تن ہمہ
رت نغ داغ شد والی کیفیت پیدا ہو گئی، اس کے بعد جو تحریکیں تعلیم کے نام
ان پر اٹھیں ان میں سے ایک قاسمی تحریک تھی جسے عرف عام میں دیوبندی تحریک
ہا جاتا ہے اور دوسری علیگڑھی تحریک ۔ بعض حضرات کا دیوبندی تحریک کو

ایک مکتب فکر کے طور پر دُنیا کے سامنے پیش کرنا نامناسب سی بات ہے اسلاف سے منقول علمی وراثت کی ترویج واشاعت اور مسلمان قوم کے عہد رفتہ کی بحالی کے لئے دیوبند کا مدرسہ اور دوسرے مدارس معرض وجود میں آئے۔ الازہر، علی گڑھ، ندوہ اور جامعہ ملیہ جیسی درسگاہوں کے فضلاء کو ازہری، علیگ، ندوی اور جامعی کہنا اگر صحیح اور یقیناً صحیح ہے تو اسی طرح دیوبندی فضلا کو دیوبندی کہنا بھی صحیح ہے، اس سے آگے اس درسگاہ کے حوالہ سے کوئی بات عقل و دانش کے نقطۂ نظر سے صحیح نہیں۔

اور پھر ارباب علم اس بات سے بھی واقف ہیں کہ دیوبند اور علی گڑھ ہر دو تحریکات کے بانی یعنی مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خان کا آخری سرچشمۂ فیض ایک ہی تھا یعنی ولی اللہی خاندان کی تعلیمات ۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی کتاب موج کوثر میں تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جدید علم کلام کی تدوین اور انگریز سے مصالحت جیسے نقاط کے پیش نظر ہر دو تحریکات میں شدید بُعد پیدا ہو گیا سرسید احمد خاں مرحوم نے جدید علم کلام وضع کر ڈالا ۔ اور انگریز سے مصالحت پر پوری قوم کو ابھارنا چاہا جبکہ ارباب دیوبند اس کے قطعاً روادار نہ تھے وہ علم کلام کے جدید اسلوب کے تو حامی تھے لیکن افکار ملی میں تغیر و تبدل ان کے نزدیک کسی طرح درست نہ تھا بلکہ وہ اسے الحاد و زندقہ سے تعبیر کرتے جب کہ انگریز سے مصالحت کو وہ اجتماعی خودکشی سے تعبیر کرتے ۔ تاہم انکی خواہش یہ تھی کہ علی گڑھ کی درسگاہ ملت کے مقاصد کے کام آئے اور اس کے لئے ضروری تھا کہ اس بُعد اور خلیج کو پاٹا جائے ۔ حضرت شیخ الہند جیسے مجدد وقت کی نظر اس بات پر برابر تھی اور گو کہ اس ضمن میں پہلے بھی کوششیں ہو چکی تھیں لیکن ان کوششوں کو منظم شکل دینے والے ——— حضرت شیخ الہند تھے ——— شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں ۔

"ملکی معاملات میں دونوں (مولانا نانوتوی اور سرسید) کا طریق کار مختلف تھا جنگ آزادی میں سرسید نے ایک فریق کا

ساتھ دیا تو دوسرے نے اس کے مخالف فریق کا - مولانا محمود الحسن کو
بھی علی گڑھ سے کم اختلافات نہ تھے، انہیں سرسید سے پیر بھائی یا
استاذ بھائی ہونے کا بھی وہ ربط حاصل نہ تھا جو سرسید اور بعض
بزرگان دیوبند کے درمیان تھا لیکن خدا کی قدرت ہے کہ ان کے
زمانے میں علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان خلیج پر ہونے کا سامان
ہوا -" (موج کوثر ص۲۰۱ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء)

حضرت شیخ الہند نے اس سلسلے میں جو پہلا قدم اٹھایا وہ ۱۹۰۶ء میں جمعیۃ الانصار کا قیام تھا جس میں علی گڑھ کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد برابر شریک ہوتے پھر ۱۹۱۱ء کے دار العلوم دیوبند کے سالانہ جلسہ دستار بندی میں صاحبزادہ صاحب شریک ہوئے اور اسی موقعہ پر دونوں درسگاہوں کے طلبہ کے تبادلہ کا پروگرام طے ہوا جس کا تلخ نتیجہ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کی شکل میں سامنے آیا کہ انیس احمد نامی طالب علم جو علی گڑھ سے تعلق رکھتے تھے غیروں کی سی۔آئی۔ڈی کے فرائض انجام دینے میں لگ گئے - تاہم جب ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف کی بنیاد ڈالی گئی تو اس کے سرپرستوں میں علی گڑھ کے سیکرٹری نواب وقار الملک برابر کے شریک تھے اور شیخ الہند اسارت مالٹا سے جب واپس ہوئے تو تکلیف کے باوصف جامعہ ملیہ کے افتتاح کیلئے علی گڑھ گئے اور وہاں ایک تاریخی تقریر فرمائی جس کے یہ جملے ان کے ظرف کی بلندی اور حوصلہ مندی کے شاہد عدل ہیں — یہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کی تقریر ہے - شیخ نے فرمایا -

"اے نونہالان وطن، جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے
غم خوار، جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی تھیں، مدرسوں
اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں
تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ
کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں
دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا ..."

شیخ الہند کے یہ تمام اقدامات جن میں نظارۃ المعارف بھی شامل تھا، قرآنی رُوح سے ملّت کے نوجوانوں کو آشنا کرنے اور دونوں طبقوں کا آپس میں رشتہ جوڑنے کی غرض سے تھے — قرآن کے معاملہ میں آپ کے احساسات کا اندازہ مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالےٰ کے حوالہ سے سامنے آنے والی اس وصیت و نصیحت سے ہوسکتا ہے جو وفات سے چند دن قبل مخصوص حضرات کو کی گئی — آپ نے فرمایا ۔

”میں نے جیل کی تنہائیوں میں غور کیا کہ پوری دنیائے اسلام دینی اور دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہی ہے؟ تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے ایک ان کا قرآن چھوڑنا دوسرے آپس میں اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے عزم — لیکر آیا ہوں کہ قرآن کریم کی تعلیمات اور ان پر عمل کو عام کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدل کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے“

یہ بات تو اسارت مالٹا سے واپسی کی ہے کہ ان کے جذبات میں یہ شدت پیدا ہوچکی تھی اس سے قبل بھی آپ ان باتوں سے غافل نہ تھے چنانچہ دیوبند اور علی گڑھ جیسے دو مقامات کا آپس میں رشتہ جوڑنا معمولی درجہ کی بات نہ تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان مقامات میں نفرت کی دیواریں حائل ہوچکی تھیں ان کو پاٹنا اسی مجدّدِ وقت کا کام تھا اور پھر نظارۃ المعارف اور اس کے بعد جامعہ ملّیہ کا قیام وہ انقلاب آفریں اقدام تھے کہ شاید آج ان کا ہمیں اندازہ نہ ہوسکے ۔

نظارۃ المعارف کے لئے مولانا سندھی کا انتخاب حضرت شیخ الہند کی دوررس نگاہ نے کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا نومسلم تھے نومسلم کے جذبات جو ہوسکتے ہیں ان سے ایک زمانہ آگاہ ہے آپ نے قرآن اس طرح پڑھا کہ وہ آپ کی رُوح کی گہرائیوں میں اتر گیا اور پھر مدۃ العمر یہی آپ کا مشغلہ رہا۔ اُدھر آپ کو قدرت نے وہ صلاحیتیں بخشی تھیں کہ آپ جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے ان کی زبان میں گفتگو کرکے انہیں مطمئن کرنا جانتے تھے۔

شیخ محمد اکرام مرحوم جیسا جدید تعلیم یافتہ مصنف مولانا کو مغربی مادیت اور مشرقی رُوحانیت کا حسین امتزاج قرار دیتا ہے اور مولانا کو شیخ الہند کا دماغ سمجھتا ہے ۔

اکابر دیوبند کے افکار بالخصوص فلسفۂ جہاد کے سلسلہ میں علی گڑھی احباب کو جو شبہات لاحق تھے، شیخ الہند خود اس کا اعتراف فرماتے کہ وہ بے بنیاد نہیں ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں کہ انہیں حل نہ کیا جا سکے ۔ اور ان کے حل کے سلسلہ میں ان کی نظر انتخاب مولانا سندھی پر پڑی ۔ مولانا سندھی اس بات کو اپنے استاذ گرامی مولانا محمود الحسن کا فیضان سمجھتے اور فرماتے کہ :

”خدا کے فضل سے ہمیں حضرت شیخ الہند کی صحبت کے فیض سے اس مسئلے میں پورا اطمینان حاصل ہو گیا تھا چنانچہ علی گڑھ کے طلبہ سے اس معاملہ میں اگر ہماری گفتگو ہوتی تو ہم انہیں جہاد کا مقصودِ اصلی اچھی طرح سمجھا سکتے تھے ۔“ (موج کوثر ص ۲۰۳)

نظارۃ المعارف کی شکل میں یہ اسٹیج فراہم ہوئی اور مولانا کو اس کا موقع ملا تو مختصر وقت میں ایک ایسی کھیپ تیار ہو گئی جو سر سید احمد خان مرحوم کے فلسفہ تعاون کے بجائے عدم تعاون کی علمبردار ثابت ہوئی جس کا نتیجہ جامعہ ملیہ کی شکل میں سامنے آیا ۔ مولانا سندھی کے کابل تشریف لیجانے کے بعد مولانا احمد علی اس سلسلہ کو احسن طریق سے چلاتے رہے وہ مولانا سندھی کے پُرانے معتمد اور حضرت شیخ الہند کے ہی فیض یافتہ تھے انکی گرفتاری کے بعد وہ بزم بظاہر سونی ہو گئی ۔ لیکن یہ دونوں بزرگ جہاں گئے شبلی کے الفاظ میں نظارۃ المعارف قائم کر کے بیٹھ گئے مولانا سندھی نے کابل، روس اور ترکیہ میں جس طرح قرآن کی خدمت کی اس کے لئے مرحوم ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی ملاحظہ کی جا سکتی ہے کہ آپ ایک دن اس سے غافل نہ ہوئے اور علماء کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو برابر قرآن پڑھاتے رہے ۔ روس جیسے الحاد زدہ ملک میں آپ نے ذرہ برابر خوف محسوس نہیں کیا اور کتاب الٰہی کے معارف پھیلانے میں مشغول ہو گئے اور جب آخر میں

مکہ معظمہ پہنچے تو اس سرزمین وحی پر برابر گیارہ برس کتاب مقدس کے انوار پھیلائے۔ مولانا عبداللہ لغاری اور علامہ موسیٰ جاراللہ جیسے حضرات نے اسی دور میں آپ سے استفادہ کیا۔ علامہ موسیٰ اس سے قبل روس میں بھی استفادہ کر چکے تھے۔ مولانا سندھی اپنی سرگذشت میں اپنے قیام مکہ معظمہ کا محبوب ترین مشغلہ قرآن کی خدمت اور امام ولی اللہ دہلوی کی کتابوں کی تدریس قرار دیتے ہیں۔
(سرگذشت کابل ص۱۴)

آپکے اسی دور کے نوٹس ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ کے توسط سے محفوظ ہوئے اور پھر پاکستان پہنچے جن کی بنیاد پر ہائی کورٹ لاہور کی انسپکشن ٹیم کے ممبر ڈاکٹر منیر احمد مغل نے انہیں مرتب کیا جو عنقریب شائع ہونے والے ہیں — اور مکہ معظمہ سے واپسی کا مختصر وقت دیوبند، دہلی، لاہور، کراچی، سندھ اور دین پور شریف میں جو گذرا تو اسی کتاب کی خدمت میں۔ دہلی میں آپ کا قیام ان دنوں جامعہ ملیہ میں ہوتا جہاں کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین آپکے عزیز دوست اور بھائی مولانا سید حسین احمد مدنی رح کے مرید و تربیت یافتہ تھے وہ شیخ الہند، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری اور نواب وقار الملک کے سینچے ہوتے پوٹے کے رکھوالے تھے۔ انہوں نے دہلی کے بہترین دماغ جامع میں اکٹھے کئے جنہوں نے مولانا سندھی سے قرآن پڑھا ان میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب خود ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور دوسرے حضرات شامل تھے — اُدھر مولانا احمد علی کو دیکھیں تو ان سے ان کے استاذ گرامی مولانا سندھی نے باقاعدہ بیعت لی تھی کہ خدمت قرآن نہیں چھوڑنی - چنانچہ اس وقت سے لے کر اپنے یوم وفات ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء بروز جمعرات تک برابر اس سلسلہ میں مشغول رہے۔ دہلی سے گرفتاری کے بعد آپ کو ضلع جالندھر اور شملہ نظر بند رکھا گیا جیسے تیسے بھی ہوا وہاں ایک آدھ مسلمان قیدی تلاش کر کے اس عہد وفا کو نبھایا اور پھر جب لاہور نظر بند ہوئے تو یہی بات رہی اور جب تھانہ نولکھا کی نظر بندی سے رہا ہوئے تو ایک دن ضائع کئے بغیر شیرانوالہ کے علاقہ میں اللہ کا نام لینا شروع کر دیا۔ اور قرآن کا

درس جاری فرما دیا۔ جب آپ لاہور تشریف لائے تو پورے لاہور میں ایک جگہ درس قرآن نہ تھا لوگ مثنوی شریف کا درس دیتے۔ اس راہ میں جو مشکلات آئیں وہ آئیں لیکن اس "عنقا" کا آشیانہ بلند تھا اس لئے کسی چیز کی پرواہ نہ کی۔ درمیان میں ہجرت کابل کا مرحلہ آیا تو درس نہ چھوٹا، سفر حرمین کی نوبت آئی تو تدریس جاری رہی۔ ملک میں تبلیغی دورے ہوئے تو جہاں پہنچے نماز باجماعت کے اہتمام کے لئے اپنی گھڑی مسجد کی گھڑی سے ملا کر وہاں کی مسجد سے اوقات نماز معلوم کرائے اور درس کا اہتمام فرمایا۔ لاہور میں علماء کے ساتھ ساتھ عوام اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے دروس کے سلسلے جاری ہوئے پھر بچیوں کا انتظام کیا آپ کی پڑھائی ہوئی بچیاں اس وقت اللہ کے فضل سے دنیا کے مختلف حصوں میں تدریس قرآن میں مشغول ہیں حال ہی میں ہمارے ایک دوست تبلیغی جماعت کے ساتھ بعض یورپین ممالک میں گئے تو وہاں کے ایک سفارت خانہ کے فرسٹ سیکرٹری کی اہلیہ —— جنہوں نے حضرت لاہوری کے تعلق سے نہ صرف دعوت کی بلکہ بتایا کہ میں اپنے استاذ گرامی کی نصیحت کو پورا کرنے کے لئے یہاں دیار غیر میں مصروف تدریس قرآن ہوں لاہور میں جن حضرات نے آپ سے پڑھا انہیں جہاں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا قاری محمد طاہر قاسمی، مولانا عبدالحنان ہزاروی، مولانا عبداللہ بہلوی شجاع آباد، مولانا کفیل احمد بجنوری استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ، مولانا ابوالبیان حماد اور مولانا مفتی بشیر احمد پسروری شامل ہیں وہاں علامہ علاؤ الدین صدیقی خواجہ عبدالوحید ایڈیٹر الاسلام (انگلش)، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر محمد فاروق (دیال سنگھ کالج)، شیخ محمد عظیم ایڈووکیٹ، پروفیسر سعادت علی خاں، ڈاکٹر عبداللطیف ایم۔ بی۔ بی۔ ایس، چودھری عبدالرحمٰن خان ایم۔ اے۔ ایل، ایل، بی، مولوی بشیر احمد لدھیانوی بی۔ اے، مولوی محمد مقبول عالم بی۔ اے اور حافظ فضل الٰہی ایم۔ اے۔ جیسے جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی شامل تھے۔

آپ کے درس قرآن کا شہرہ تھا کہ حضرت مولانا حسین علی صاحب وال بھچراں، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی اور

مولانا حافظ عبدالرحمن محدث امروہی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اکابرین اور ارباب علم وفضل کی سفارش لے کر طلبہ آتے اور داخل ہوتے۔ اس کے علاوہ مولانا مدنی تو ہر سال دورۂ حدیث کے طلبہ کو تلقین کرتے کہ تمہارے علوم کی تکمیل مولانا احمد علی کے یہاں ہوگی۔

اس خدمتِ قرآن نے انہیں گوہر شب چراغ بنا دیا، اور آج کم از کم پنجاب کے طول وعرض میں جو قرآنی خدمت نظر آرہی ہے اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ سبب آپ ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ترجمہ وتفسیر لکھنے کی توفیق بخشی تو ہر مکتب فکر کے علماء نے اسکی تحسین کی۔

الغرض ۱۹۱۳ء میں دہلی سے جس سلسلہ خیر کی ابتدائی شکل نظارۃ المعارف ہوئی تھی، جنگ عظیم اول اور دوسرے حوادث کے سبب وہاں تو وہ سلسلہ بہت کم دیر چلا لیکن مولانا سندھی تھے تو اپنی وفات ۱۹۴۴ء تک اور مولانا لاہوری تھے تو اپنی وفات ۱۹۶۲ء تک ایک دن بھی اس بنیادی کام سے غافل نہ ہوئے اور یہی ایک بندہ مومن کی شان ہے — اللہ تعالیٰ ان اکابر کو اپنی خصوصی رحمتوں سے نوازے اور ان کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل کی ان کے اخلاف کو توفیق بخشے، سعادت مند ہیں وہ لوگ جن کی عمریں قرآن عزیز کی نذر ہو رہی ہیں اسلئے کہ اس سے بڑھ کر نہ کوئی خدمت ہے نہ سعادت۔

اللّٰھم صل علی محمد وعلی آل محمد — اللھم وفقنا لما تحب وترضی

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین —

ڈاکٹر ابصار احمد ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی

کی تالیف (بزبان انگریزی) صفحات ۱۶۰

کانٹ اور کرکیگارڈ

ایک تقابلی مطالعہ

(عنقریب شائع ہو رہی ہے!)

ناشر: مکتبہ کاروان، کچہری روڈ، لاہور